ہل جوتا

اشتیاق سعید

B-01، میرا پارا ڈائرسی ایچ ایس، گیتا نگر فیس۔II، بالا جی چوک، میرا روڈ، (تھانے)، موبائل: 9224799971

''جوکھوا رے.... اے جوکھوا۔'' ٹھاکُر رام پال کھیت کی مینڈ پر کھڑے چمرٹولے کی جانب رُخ کئے جوکھو ہل جوتے کو ہانک لگا رہے تھے۔ آواز سُنتے ہی جوکھو جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ ادھیڑ عمر، لاغر سا، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں، ننگا بدن، ستر پوشی کی خاطر کمر کے گِرد گمچھ لپیٹے ہوئے تھا۔ وہ ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنا کر چُندھیائی آنکھوں سے آواز کی سَمت دیکھا۔'' ارے دڈّا ہو دڈّا.... بابو ساحیب۔'' اُس کے لب پھڑ پھڑائے اور سراپا تھر تھر کانپنے لگا۔

''جوکھوا رے۔'' آواز دوبارہ اُس کی سماعت سے ٹکرائی جواباً اُس نے بھی نُطق پر زور لگایا۔'' آوت ہوں بابو ساحیب'' اور سرپٹ دوڑ پڑا۔ کھتّی، خاردار جھاڑیاں اور کھیت کی مینڈوں کو لانگھتے پھلانگتے ٹھاکُر رام پال کے حضور پہنچ کر بینگا چلے بیل کی مانند ہانپنے لگا۔ ٹھاکُر آپے میں نہ تھا کھینچ کے ایک زنّاٹے دار تھپّڑ اُس کے سوکھے پچکے گال پر جڑ دیا۔

''کا رے ح.... جادہ! ای بیلا بھئی گئی۔ گھام (دھوپ) سر پہ چڑھ آوا، لیکن کھیت میں اب تک ہل ناہی پڑا۔ جانگر چور کہیں کا!.... کھائے کے تواڑھائی سیر چاہی اور کام....؟''

ٹھاکُر کے اس برتاؤ سے اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور گلا رُندھ گیا۔

''بابو ساحیب بلیا کی متاری (ماں) بہت بیرام (بیمار) ہو۔''

''بیرام ہے تو کا ہوا.... مری تو نہیں نا؟.... چل.... (گالی کی آواز) جلدی سے ہل بیل لئے آؤ، آٹھ دن سے زیادہ ہو گوا سینچائی ہوئے۔''

''آج بھر آؤ رجائے دیو بابو ساحیب۔''

''دھت سارے.... کھیتوا ٹنک جائی تب جوتے؟''

''ناہی بابو ساحیب، بس آج....''

''چُپ.... اب ہم کچھ نہیں سُنتا چاہت.... بس ہم ایتا جانت ہیں کہ چاہے جو ہو آج ہمار کھیت جوتا جائے چاہی، چاہے بلیا کی متاری جئے یا مرے۔''

ٹھاکُر تو اپنا فرمان جاری کر کے چلا گیا، لیکن جوکھو کی آنکھوں کی نہر اُس کے سوکھے پچکے گالوں کے کھیت سینچنے لگی اور اُس کے سینے پر بے بسی کے نہ جانے کتنے ہل ایک ساتھ چلنے لگے۔ وہ سوچنے لگا ہل جوتائی کا جیون بھی کوئی جیون ہے! بیلوں کے سنگ کام کرتے کرتے شاید ہم بھی بیل ہو گئے ہیں، جبھی تو جیٹھ بیساکھ کی چلچلاتی ٹٹار دھوپ، پوس ماگھ کا جاڑا اور ساون بھادوں کی برسات کی پروا کئے بغیر ہم اپنے شریر کو کشٹ دیتے ہیں۔ بدلے میں پاتے کیا ہیں؟ گالی، لات اور گھونسا... ہائے ری قسمت!

کہتے ہیں بارہ برس بیتے گھورے کے بھی دِن پھرتے ہیں.... آخر دیکھتے ہی دیکھتے ہل جوتوں کے بھی دِن پھرے، وقت نے کروٹ بدلی اور رفتہ رفتہ ہل جوتے روٹی اُگانے شہروں کی سمت کوچ کرنے لگے اور بتدریج خوشحالی اِن کا مقدر بننے لگی۔ پھر کیا تھا اِنہی کی دیکھا دیکھی نائی، دھوبی، کہار، بڑھئی، لوہار اور دوسری چھوٹی برادریاں بھی شہر سِدھارنے لگیں۔ ہل جوتوں میں سے جو گاؤں میں رہ گئے تھے اُنھوں نے ہل جوتائی یکسر ترک کر دی اور مزدور بن گئے۔ یعنی ججمانی ختم کر کے دِہاڑی پر ہل جوتنے لگے۔ اس کارن گاؤں میں آہستہ آہستہ بیلوں کے گلے کی گھنٹیاں بجنا کم ہو گئیں اور رہٹ کے نغمے بھی خاموش ہوتے چلے گئے۔ پھر اِن کی جگہ پمپنگ سیٹ، تھریشر، کریشر اور ٹریکٹر نے لے لی۔ یوں ہل جوتوں کی کمی کی تلافی ہوئی اور کام وقت سے پیشتر ہونے لگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ گاؤں میں کھادی گرام اُدیوگ نے بھی اپنے پاؤں پسارے، جا بہ جا ہتھ کرگھے گڑ گئے، دریاں اور چادریں بُنی جانے لگیں۔ گرام پنچایت کا بول بالا ہوا۔ گاؤں کی ترقی کے لیے گرام پردھانوں کو سرکاری فنڈ مہیا کیا جانے لگا۔ نہرو روزگار گارنٹی یوجنا اور مہاتما گاندھی روزگار گارنٹی یوجنا (نریگا اور منریگا) کے تحت سال میں سو دِن کی روزگار گارنٹی یوجنا لاگو ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ بینکوں سے مویشی اور مچھلی پالن کے لیے قرض منظور ہونے لگے۔ بلاک سے کسانوں کو بیج اور کھاد رعایتی نرخ پر مہیّا کیا جانے لگا۔ غرض کہ گاؤں میں پسماندہ اور محنت کش طبقہ خوشحال ہونے لگا جب کہ اعلیٰ طبقے کی مسند پر مہاجنی کا چولا پہن کے بیٹھے ہوئے لوگ نا آسودگی کا

شکار ہوتے چلے گئے۔

ٹھاکر رام پال کا بھی یہی حشر ہوا۔ کہتے ہیں کہ ہاتھی مرا بھی تو سوا لاکھ کا! باپ دادا کی زمینیں تھیں، کچھ پُرانی اشرفیاں اور روپے بھی تھے، چنانچہ سال دو سال بغیر کسی آمدنی کے کھاتے پیتے رہے۔ حالانکہ ہل جوتائی ٹوٹنے کے بعد سارے کے سارے کھیت پرتی ہی رہے۔ کبھی جوتا تک نہ گیا۔ جب کہ لوگوں نے ٹھاکر صاحب کو باور بھی کرایا کہ کھیت اگر یوں ہی پرتی رہے تو اُوسر ہو جائیں گے، جھاڑیں جھنکاڑیں تو اُگ ہی آئی ہیں، کچھ نہیں تو دو تین بانہہ جوتوا کر چری ہی بوا دینا چاہئے تاکہ کھیتوں کا جوبن بنا رہے، لیکن ٹھاکر صاحب سب سُنی اَن سُنی کر دیتے کیونکہ وہ وضع داری کی بلندی سے پستی دیکھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ وہ ہل جوتوں کو نظر کے جس زاویے سے دیکھتے رہے تھے حالات کے دائرے میں بھی وہی زاویہ چاہتے تھے۔ نتیجتاً کئی زاویے زمینیں شراب میں غرق ہوگئیں۔

جگپال نے جب باپ کی یہ گت دیکھی تو اُسے اجداد کی ساکھ لڑکھڑاتی معلوم ہوئی اور مستقبل تاریک لگنے لگا۔ لہٰذا اُسے بنجر ہوتے کھیت اور کچھ آمدنی کی فکر لاحق ہوئی۔ پہلے تو اُس نے سوچا کیوں نہ کھیت بٹائی پر دے دیا جائے؟ نہ جوتنے بونے کا جھنجھٹ نہ فصل کاٹنے کا پچڑا! گھر بیٹھے آدھا اناج مِل جایا کرے گا۔ پھر اچانک اُس کی سوچ گویائی میں مبذول ہو گئی۔ ''نہیں نہیں یہ ٹھیک نہیں رہے گا.... ایسے تو وہ لوگ جو ہم سے دبتے اور سہمتے ہیں برابری کرنے لگیں گے.... نہ.... کچھ اور سوچنا چاہئے۔''

بہر حال کافی غور وخوض کے بعد ٹریکٹر خریدنے کی بات اُس کے ذہن میں سمائی۔ پھر ایک دن ڈرتے ڈرتے یہ بات ٹھاکر صاحب کے بھی گوش گزار کر دی۔ ٹھاکر صاحب سُنتے ہی آگ بگولہ ہوگئے۔ صرف مارا نہیں باقی سب کچھ بکھان دیا۔ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اُس وقت تو جگپال چُپ ہو رہا، لیکن موقع بے موقع ٹھاکر صاحب کو ٹریکٹر کے فوائد سے آگاہ کرنا نہ بھولتا۔ کہتے ہیں پتھر پر ایک ہی جگہ بار بار رسّی کے گھسنے سے پتھر بھی کٹ جاتا ہے۔ خیر سے ٹھاکر صاحب تو انسان تھے، آخر کار ایک دن اُنھوں نے جگپال کو ٹریکٹر خریدنے کی منظوری دے دی۔

منظوری ملتے ہی جگپال نے فوراً سے پیشتر کچھ زمینیں اونے پونے داموں فروخت کر دیں اور ٹریکٹر لے آیا۔ پھر کیا تھا سُوکھی بنجر ہوتی زمینوں کو نہر کے پانی سے سیراب کیا گیا اور ٹریکٹر سے کئی کئی پھیرا جوت کر مٹّی کو نرم اور بھربھری بنا کے خریف کی فصل بو دی گئی.... مٹّی کی سوندھی سوندھی مہکاریں جب نتھنوں میں سرایت کرنے لگیں اور ہاتھ پیروں نے مٹّی کا شفقت آمیز لمس محسوس کیا تو جگپال کو کھیتی سے اُنسیت ہوگئی اور وہ فصل کا خوب خوب خیال کرنے لگا۔ حسبِ ضرورت کھاد، پانی نیز جراثیم کُش دوائیں مُہیا کرتا رہتا۔ نتیجتاً محنت رنگ لائی۔ فصل دوسروں کی بہ نسبت اچھی ہوئی۔ اتنی اچھی کہ سارا گاؤں رشک کرنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگوں کی نگاہ میں محنت اور لگن کی تمثیل بن گیا، ہر سُو اُس کا چرچا ہونے لگا۔ وہ بھی اپنی اس کامیابی پر پھولے نہ سماتا تھا، مگر اُس کی یہ کامیابی دیرپا ثابت نہ ہوسکی۔ جلد ہی اس پر اوس پڑ گئی۔ کیونکہ بوائی تو اُس نے جیسے تیسے کر دی تھی، لیکن اب کٹائی کیسے ہو؟ تمام مزدور تو اپنے اپنے کھیتوں کی کٹائی میں جُٹے تھے۔ دُگنی اُجرت پر بھی کوئی راضی نہ ہوتا تھا۔ وہ جس کسی سے کہتا وہ معذرت کرتے ہوئے کہتا:

''ٹھاکر بابو بادل ہر گھڑی چھائے رہت ہے، کہیں پانی برس جائی تہ ہم لوگن کا سب محنت پانی ہوئی جائی۔ دَونی اوسونی ہوئی جائے دیو.... دانا بھوسا کھریان سے اُٹھ جائے تب آپو کا کٹّیا کر دیا جائی۔''

جانے کیسے یہ بات ٹھاکر صاحب تک جا پہنچی اور وہ سُنتے ہی آپے سے باہر ہوگئے۔ ''..... کی ای مجال۔ نچکٹ کہیں کے۔'' پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ کھیت جا پہنچے اور کسی الھڑ دوشیزہ کی مانند جھومتی اِٹھلاتی فصلوں کو اپنے کرودھ کی اگنی دِکھا دی اور دیکھتے ہی دیکھتے کھڑی فصل جل کے سوا ہا ہوگئی۔ جگپال باپ کے مزاج سے واقف تھا چُنانچہ چُپّی سادھے رہنے ہی میں عافیت جانی۔

گاؤں والے جگپال کی فصل دیکھ کر ٹریکٹر کی افادیت کا اندازہ کر چکے تھے اور وہ بھی اپنے کھیتوں کو ہل کے بجائے ٹریکٹر سے جوتنے کی ترکیب پر غور کرنے لگے تھے۔ جب یہ خبر جگپال تک پہنچی تو اُسے اپنے بیکار ہوتے ٹریکٹر کا استعمال اور آمدنی کا راستہ سجھائی دینے لگا۔ موقع کو غنیمت جان کر فوراً برائے کرایہ ٹریکٹر سے کھیت جوتنے کی پیش کش کر دی۔ گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پھر کیا تھا ایک ایک کر کے کھیت ٹریکٹر سے جوتا جانے لگا اور گھنٹوں کا کام مِنٹوں میں ہونے لگا۔ اس سے لوگوں کو اس قدر آسانیاں میسّر آئیں کہ رفتہ رفتہ سبھی نے ہل سے کھیت جوتنا غالباً ترک کر دیا اور ٹریکٹر سے جوتنے کی خاطر جگپال سے رابطہ قائم کرنے لگے۔ اِدھر مزدور ہل جوتوں نے بھی ٹریکٹر کی غرض وغایت محسوس کی اور وہ بھی اس مشینی دور کی صف میں آن کھڑے ہوئے۔ بہر حال جگپال کا کام اس حد تک بڑھ گیا کہ اُسے کھانے تک کو فرصت نہ ملتی گو اُس نے ٹریکٹر کا کرایہ دُگنا کر دیا اور رقم بھی پیشگی لینے لگا۔ باوجود اس کے کام وقت پر نہیں ہو پاتا تھا۔ لوگ کھیتوں کو سینچ کر جوتائی کے لیے اپنی باری کے منتظر رہتے۔

جو کھو ہل جوتے کے بیٹے بلیا نے بھی اپنا کھیت جوتنے کی خاطر پیشگی

رقم دے رکھی تھی، مگر اُس کی باری آتی ہی نہ تھی۔ جو بھی دِن اُس کے لیے مختص ہوتا اُس دِن ٹریکٹر کسی اور کے کھیت میں چلتا۔ اِس طرح تین دفعہ اُس کے کھیت سینچنے کے بعد سوکھ چکے تھے۔ چوتھی دفعہ بھی جب ایسا ہی ہوا تو وہ جھنجھلا گیا اور جگپال کو تلاش کرتا حویلی جا پہنچا.... اِن دِنوں ٹھاکُر صاحب بیمار تھے اور جگپال اُن کی تیمار داری میں مشغول تھا۔ بلیا اُسے پُکارتا بے دھڑک حویلی میں داخل ہوگیا۔ بلیا کو دیکھتے ہی جگپال چونک پڑا۔ کنکھیوں سے باپ کی جانب دیکھا، اُن کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں پھیلنے اور سُکڑنے لگی تھیں۔ چنانچہ وہ جھٹ اُٹھ کھڑا ہوا اور بلیا کا گٹّا پکڑ کر اُسے باہر لے جانے کے لیے کھینچنے لگا، لیکن بلیا ٹس سے مس نہ ہوا۔ انگد کے پاؤں کی مانند اُس کے بھی پاؤں دھرتی پر جمے رہے۔ جگپال میں اتنا بل کہاں تھا جو وہ بلیا کی کاٹھی ہلا دیتا۔ آخر تھک کر اُس سے منّتیں کرنے لگا۔ باپ کی بیماری کی دُہائی دیتے ہوئے اُسے بہلانے پھسلانے لگا، مگر بلیا نے اُس کی ایک نہ سُنی، بس اُس کی زبان سے بار بار ایک ہی جملہ پھسلتا ''چاہے جو ہو بابوساحیب آج ہمار کھیت جوتائے جا ہی۔'' ٹھاکُر صاحب حیران تھے کہ ماجرا کیا ہے؟ اُن کی آنکھوں میں حیرت و استعجاب کے سائے لہرانے لگے تھے اور ماتھے کی سلوٹیں سوالیہ علامت کی شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔ جگپال باپ کی کیفیت تاڑ چُکا تھا، مگر کرتا بھی تو کیا؟

فی الوقت اُس کی حالت سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی سی تھی نہ اُگلتے بنتی تھی نہ ہی نگلتے۔ جب وہ کافی مِنّت سماجت کے باوجود بھی وہاں سے نہ ٹلا تو جگپال کے اندر کا چھتریہ آپے سے باہر ہوگیا اور وہ ٹھکرئی دھونس جماتے ہوئے غرّایا:

''سُن رے ح.....جادہ۔ اب تو ر بھلمنسی (بھلائی) یہی میں ہے کی اہاں سے جھٹ پٹ نکل جا۔''

''ناہیں تو کا کروگے؟'' بلیا کے بھی تیوری پر بل چڑھ آیا۔

''لگب پٹک کے توڑے، بھو....والے بیس دفعے کہہ چکے بابا کا جی اچھا نہیں ہے تو سمجھ میں نہیں آوت....چل جا، کل پرسوں تک تو ر کھیت جوتا جائی۔''

اِتنا سننا تھا کہ بلیا نے لپک کر جگپال کا گریبان پکڑ لیا اور اوپر کو تانتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّایا۔ ''خبردار اب جو گریائے....مائی مچھو (ماں قسم) تالو سے جیبھ کھیچ لیب....ارے کھیت سینچے میں روپیہ لاگت ہے روپیہ!....ہمرے روپیہ حرام کا نہیں آوت، کان کھول کے سُن لیو، آج چاہے جو ہو ہمار کھیت جوتائے جا ہی۔ چاہے ٹھاکُر جئیں یا مریں۔''

یہ سُنتے ہی جگپال کے پیروں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہونے لگی۔ ٹھاکُر صاحب جو کہ اُٹھنا چاہ رہے تھے دھم سے بستر پر گر پڑے اور یک بہ یک اُن کی آنکھوں کے آگے جوکھوہل جوتے کا چہرہ گھومنے لگا۔

◆◆◆

آثارالصنادید

اردو اکادمی، دہلی نے سر سید احمد خاں کی لافانی تصنیف ''آثارالصنادید'' کا اصل متن نامور محقق ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

سر سید احمد خاں کی لافانی تصنیف ''آثارالصنادید'' تاریخ سے سر سید کے علمی، تحقیقی و ثقافتی دلچسپی کا نقشِ آغاز ہے۔ اس میں انھوں نے دلّی کے آثارِ قدیمہ اور تاریخی عمارات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے اپنے مقدمہ میں سر سید احمد خاں کے حالاتِ زندگی کے ساتھ ان عوامل کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے سر سیّد کو یہ کتاب تیار کرنے پر آمادہ کیا نیز فنِ تعمیر پر بھی تحقیقی انداز میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔

دہلی کے آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں نیز تاریخ و تحقیق کے طالب علموں کے لیے اردو اکادمی، دہلی کا ایک نایاب تحفہ۔

صفحات: ۷۲۸، (دوسرا ایڈیشن) قیمت: ۲۴۰/روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی